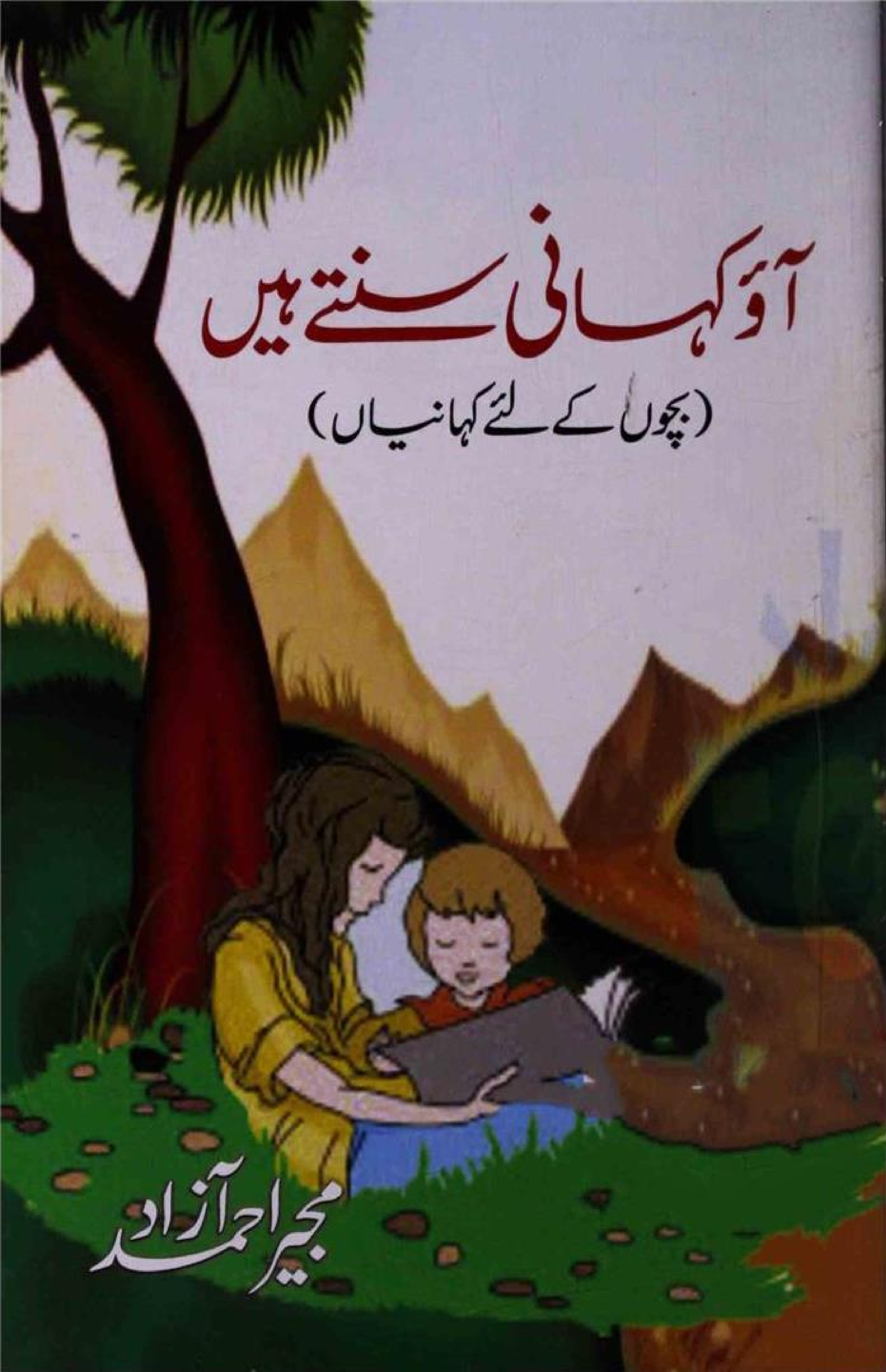

آؤ کہانی سنتے ہیں

(بچوں کے لئے کہانیاں)

مجیر احمد آزاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آؤ کہانی سنتے ہیں

(بچوں کے لئے کہانیاں)

مجیر احمد آزاد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

Aao Kahani Sunte Hain
Stories For Children
by
Mojeer Ahmad Azad
Year of Edition 2015
ISBN 978-93-5073-578-7
₹ 40/-

کتاب	:	آؤ کہانی سنتے ہیں (بچوں کے لئے کہانیاں)
مصنف	:	مجیر احمد آزاد
پتہ	:	محلّہ فیض اللہ خان، خان صاحب کی ڈیوڑھی، دربھنگہ
موبائل نمبر	:	۹۴۳۰۸۹۸۷۶۶
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۴۰ روپے
سن اشاعت اوّل	:	۲۰۱۵ء
کمپوزنگ	:	(محمد ارمان) ارمان گرافکس، لال باغ، دربھنگہ
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی۔٦

ملنے کے پتے:۔۔۔۔۔۔

(۱) ناولٹی بکس، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

ان بچوں کے نام

جو

آج بھی کہانی پڑھنا

اور

کہانی سننا چاہتے ہیں

فہرست

☆	صفحہ نمبر
☆ کہانی سے پہلے	7
(۱) خالد کی عید	8
(۲) خالہ کا گھر	12
(۳) دوستی	15
(۴) نیک کام	19
(۵) نصیحت	21
(۶) مراد کی سمجھداری	24
(۷) نانی کی بکری	28
(۸) اچھی لڑکی	33
(۹) پنڈت گوپی ناتھ	36
(۱۰) آخری کوشش	41
(۱۱) مرجھائے پھول	48
☆ مصنف کا تعارف	55

کہانی سے پہلے

''آؤ کہانی سنتے ہیں'' بچوں کے لئے لکھی گئی میری کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں کی تخلیق کا مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت میں معاونت کے ساتھ ان کے اندر اعلیٰ انسانی قدروں کی پاسداری کا جذبہ فزوں تر کرنا ہے۔ کہانیاں بچوں کے لئے اخلاق اور کردار سازی کا ایک موثر ذریعہ ہو سکتی ہیں، ایسا میرا ماننا ہے۔ کہانیوں کے توسط سے زبان و ادب کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ بچوں کے اندر محبت، بھائی چارہ، ہمدردی، بھلائی، خیر خواہی، دست گیری جیسی صفات بہ آسانی پیدا کی جا سکتی ہیں۔

ان کہانیوں کے بارے میں مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

مجیر احمد آزاد

محلہ: فیض اللہ خاں
خان صاحب کی ڈیوڑھی
دربھنگہ۔ ۸۴۶۰۰۴ (بہار)
موبائل: ۹۴۳۰۸۹۸۷۶۶

خالد کی عید

عید گاہ جانے والی سڑک پر کافی چہل پہل تھی۔ رنگ برنگے نئے نئے لباس پہنے ہوئے لوگوں کا سلسلہ لگا ہوا تھا۔ بستی میں ہر طرف خوشیوں کا ماحول تھا، فضا بھی معطر تھی۔ بچے اپنے بزرگوں کے ساتھ شاداں وفرحاں عید گاہ کی جانب چلے جا رہے تھے۔ ننھے خالد کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی جس پر سفید اُون کی کشیدہ کاری تھی۔ چوڑی دار پائجامہ اور گھٹنے سے نیچے تک کی شیروانی اس پر خوب پھب رہی تھی۔ وہ بار بار شیروانی جیب میں ہاتھ ڈال کر ان سکّوں کو چھو لیتا تھا جو عید گاہ چلتے وقت امّی نے دیے تھے۔ وہ ابّو کی اُنگلی تھامے اتنا مسرور تھا مانو سارے جہاں کی دولت مل گئی ہو۔

عید گاہ آبادی سے تھوڑی دور تھی۔ سڑک کے علاوہ کئی لوگ پگڈنڈیوں سے اس طرف چلے آ رہے تھے۔ منظر بڑا ہی دلکش تھا۔ خالد کے کئی ساتھی راستے میں ملے لیکن اس کی آنکھیں تو اپنے سب سے اچھے دوست وقار کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہرے بھرے کھیتوں کے کنارے عید گاہ کے تین گنبد تازہ رنگ آمیزی کے بعد بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ چہار دیواری کے باہر بانس بلّیوں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی دکانیں سجائی گئی تھیں۔ کئی رنگوں والا بڑا غبارہ بچوں کے لئے خاص طور سے پرکشش تھا

جوڈور کے سہارے ہوا میں تیر رہا تھا۔ مٹھائی کی دکانوں سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ کھلونے بیچنے والے نے تخت پر کھلونے پھیلا رکھے تھے۔ آئس کریم والا آواز لگا کر متوجہ کر رہا تھا۔ آئس کریم دیکھ کر خالد کے منہ میں پانی بھر آیا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ امّی نے عید کی نماز سے قبل کچھ کھانے کو منع کیا تھا کہ کپڑے گندے ہو جائیں گے۔

گاؤں عید گاہ تقریباً بھر چکی تو امام صاحب تقریر کرنے کو کھڑے ہوئے۔ خالد نے نگاہ دوڑائی تو اسے ایک کنارے وقار دکھائی پڑا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر کچھ اشارے ہوئے۔ خالد اپنے ابّو سے اجازت لے کر وقار کے پاس آیا۔ وقار نے سفید سوتی کُرتہ اور پائجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر گول ٹوپی تھی جس پر پھندنا نہیں تھا۔ خالد نے ایک ہی سانس میں اپنی عیدی اور نئے کپڑوں کے بارے میں وقار کو بتا دیا۔ وقار کی نگاہیں خالد کی چمکتی ہوئی ململ کی پھندنے دار ٹوپی پر لگی رہیں۔ وہ بڑی حسرت و یاس سے خالد کے کپڑوں کو تکتا رہا۔ وہ اپنے ماموں کے ساتھ عید گاہ آیا تھا۔ خالد واپس اپنے ابو کے پاس آ کر بیٹھ گیا کیوں کہ امام صاحب مائیک پر بھی لوگوں کو بیٹھ جانے اور غور سے دین کی باتیں سننے کو کہہ رہے تھے۔ امام صاحب نے عربی میں چند جملے ادا کیے جو خالد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بس اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر جب امام صاحب اُردو میں تقریر کرنے لگے تو خالد اس طرف متوجہ ہو گیا۔

"حاضرین! پورے ایک مہینہ روزہ کے بعد عید الفطر کی نماز پڑھنے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں...... عید ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اللہ کے حکم کو مانا، روزے رکھے، غریبوں کا خیال رکھا، فطرہ ادا کیا۔ عید صرف نئے کپڑے پہن کر عید گاہ آنے کا نام نہیں بلکہ سچی عید ان لوگوں کی ہے، جنہوں نے اپنی خوشی کے ساتھ پڑوسی کی خوشی کا خیال رکھا......"

ننھا خالد اپنی ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکائے بڑی غور سے امام صاحب کی تقریر سنتا رہا۔ امام صاحب نے گلا صاف کیا اور آگے گویا ہوئے۔

”جن کے پاس کئے جوڑے کپڑے ہیں مگر ان کے پڑوسی کے یہاں نیا کپڑا نہیں بن پایا تو بھلا یہ کیسی عید، عید تو ان کی ہے جنہوں نے اپنے ساتھ دوسروں کو اس خوشی میں شریک کیا۔“

امام صاحب کی تقریر کے بعد عید کی نماز ہوئی اور پھر گلے ملنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب ایک دوسرے سے گلے مل کر عید کی مبارک بادیاں دیتے رہے۔ خالد کے ابو ماجد حسین بستی کے صاحب ثروت لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ انہیں لوگوں سے گلے ملتے ہوئے خاصا وقت لگا۔ خالد اُکتا تا رہا۔ بالآخر باپ بیٹے عید گاہ سے باہر آئے۔ خالد کو منہ لٹکائے دیکھا تو انہیں آئس کریم دلایا۔ انہیں کیا پتہ خالد تو وقار سے گلے ملنے کو بے چین ہو رہا تھا۔

ماجد حسین نے اسے کھلونے اور مٹھائیاں خرید دیں۔ وہ گھر واپس آیا تو لذیذ سویاں اس کی منتظر تھیں۔ امّی نے گلے سے لگایا اور عید گاہ جانے آنے کی روداد سننے لگیں، وہ مسرور تھیں بھلا کیوں نہ ہوتیں، ان کا اکلوتا بیٹا خالد عید گاہ جو گیا تھا۔ سویاں کھانے کے بعد خالد کو ماں نے دوسرا نیا جوڑا پہنایا اور دالان میں آئے مہمانوں کی ضیافت کے لئے باورچی خانے میں چلی گئیں۔

کافی دیر کے بعد خالد کی امّی کو بیٹے کا خیال آیا۔ اسے اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ نوکرانی کو بھیج کر پاس پڑوس میں تلاش کروایا مگر وہاں بھی خالد نہیں تھا۔ ملاقاتیوں سے گھرے ہوئے ماجد حسین کو پتہ چلا تو پریشان ہو اٹھے۔ سو سو وسوسے ذہن میں آنے لگے۔ گاؤں میں چاروں طرف لوگوں کو بھیجا اور خود سڑک پر آ نکلے

تا کہ آتے جاتے بچوں سے خالد کے بارے میں پوچھ سکیں۔ افراد خانہ پریشان ہوتے رہے۔

کچھ دیر بعد ایک عورت کی انگلی تھامے خالد بستی کے آخری حصے کی جانب سے آتا دکھائی پڑا تو ماجد حسین کے جان میں جان آئی۔ خالد سر جھکائے اسی عورت کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ماں نے دیکھتے ہی سینے سے لگایا، پھر محبت سے ڈانٹنے لگیں تو ساتھ آئی عورت پلاسٹک کی تھیلی تھماتے ہوئے بولی۔

''باجی خالد بابو کو مت ڈانٹئے، یہ میرے بیٹے وقار سے ملنے میرے گھر چلے آئے تھے۔ میں نے سویاں کھانے کے لئے انہیں روک لیا۔ کیا ہے کہ وقار اور خالد بابو مولانا صاحب کے پاس ایک ساتھ پڑھتے ہیں نا۔ بابو بہت اچھے ہیں، اللہ اقبال بلند کرے۔ یہ کپڑا وقار کے لئے لے گئے تھے۔ کہہ رہے تھے ہمارے پاس کئی جوڑے ہیں، اور وقار کے پاس صرف کرتہ پائجامہ ہے۔ میں اسے واپس کرنے آئی ہوں۔ خالد بابو بچے ہیں اسے معاف کر دیجئے۔''

خالد کی ماں نے پلاسٹک کی تھیلی سے اچکن نکال کر دیکھا تو فرط محبت سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آنگن میں کھڑے ماجد حسین نے سنا تو پل بھر کو نگاہیں نیچی کر لیں۔ پھر خوشی سے جھوم اُٹھے اور مسکراتے ہوئے بولے۔

''عید تو اس بار صرف خالد کی ہوئی ہے۔ کاش ایسی ہی عید ہم سب مناتے۔''

☆☆☆

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ، دہلی۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

خالہ کا گھر

''اب تم خالہ کے گھر نہیں جاؤ گے۔'' نادیہ نے بتایا۔

''کیوں امی؟ وہ تو بڑی اچھی ہیں۔ مجھے پیار کرتی ہیں، ملائی اور فروٹ کھلاتی ہیں۔'' ننھے حارث نے معصومیت سے پوچھا۔

''بس میں نے کہا نا! تم اب وہاں نہیں جاؤ گے۔' نادیہ نے پھر منع کیا۔

''کیوں امی بتاؤ، دانش بھیا کے گھر کیوں نہیں جاؤں؟'' معصوم سوال سے نادیہ پریشان ہو اٹھی۔ وہ جانتی تھی، وجہ جانے بنا حارث چپ نہیں ہوگا۔ اس لئے اسے بتانا پڑا۔

''تمہاری خالہ سے جھگڑا ہو گیا ہے اس لئے...... اور اب کوئی سوال نہیں۔ بس تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ اسے یاد رکھنا۔''

حارث اداس ہو گیا، وہ اچھا لڑکا تھا۔ اپنی امی کا حکم کیسے ٹال سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ صرف تین مہینے کے اندر ایسا کیا ہو گیا کہ خالہ کے یہاں جانے سے اس کو منع کر دیا گیا۔

حارث کے والد دہرہ دون میں ملازمت کرتے تھے۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔ ابھی وہ کے۔جی۔ کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ چھٹیوں میں وہ اپنی دادا دادی کے پاس لکھنؤ آ جاتا تھا۔ یہاں سڑک کے اس پار، سامنے والی گلی میں دوسرا

مکان اس کی خالہ سعدیہ کا تھا۔ حارث کے لئے وہ پسندیدہ جگہ تھی۔ وہاں اس کے دانش بھائی جو ہوتے تھے۔ ادھر دو مہینے پہلے دونوں خاندانوں میں کسی بات کو لیکر ان بن ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بند تھا۔

خالہ کا حویلی نما مکان، اس کے سامنے چھوٹا میدان، میدان کے کنارے چھوٹے بڑے ہرے پیڑ پودے اور اس پر پھُدکتے، چہچہاتے خوبصورت اور ملائم پروں والے پرندے اسکی نگاہوں میں بسے تھے۔ چہار دیواری کے اندر کی قدرتی فضا دل موہ لینے کے لئے کافی تھی۔ اس پر سے لان میں لگا ہوا جھولا، حارث بھلائے نہیں بھلا پا رہا تھا۔

حارث کے لئے خالہ کا گھر اور بھی پسندیدہ تھا کہ خالہ اسے گود میں لیکر پیار کرتی اور ملائی کھلاتی۔ دانش بھیا کی موٹی موٹی کتابیں بھی وہاں کھول کر دیکھ سکتا تھا جس میں رنگ برنگی تصویریں ہوتی تھیں۔ ٹی وی بھی تو تھا وہاں جس پر خالہ سے کہہ کر کارٹون بھی دیکھ لیتا تھا۔ اسے وہاں سب پیار کرتے تھے۔ اس لئے وہاں اسے خوب مزہ آتا تھا۔ کچھ دیر تک وہ دل مسوس کر بیٹھا رہا پھر گھر کے لوگوں کی نگاہوں سے بچتا ہوا گھر سے نکلا اور چپکے چپکے سڑک پہ آ گیا۔ رکشہ، موٹر سائیکل، آٹو، اور دوسری گاڑیاں سڑک پر تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ اسے سڑک پار کرنے میں خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کسی سے اس پار جانے کے بارے میں کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس طرح گھر والوں کو پتہ چل جاتا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں لگا ہوا تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا جب دانش دوسری طرف سے آتا دکھائی پڑا۔ وہ چلایا۔

دانش بھیا...... دانش بھیا۔

دانش نے اسے نظر انداز کرنا چاہا مگر حارث پکارتا رہا۔ دانش بھیا...... دانش بھیا۔

دانش قریب پہنچا تو جلدی سے اس کی انگلی تھام لی اور تقریباً کھینچتے ہوئے سڑک پار کر گیا اور خالہ کے گھر پہنچا۔

سعدیہ نے اسے گلے سے لگایا۔ اس کے گال چومے اور باتیں کرنے لگیں۔ وہ بھی تو اسکی معصومیت پر فدا تھی۔

ایک گھنٹے کے بعد جب حارث گھر میں دکھائی نہیں پڑا تو اس کی تلاش شروع ہوئی۔ آس پاس کے گھروں میں تلاش کر لیا گیا۔ وہ نہیں ملا تو نادیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ غصے میں بڑی بہن سعدیہ کے گھر پہونچی۔

حارث ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھا تھا اور ملائی کھا رہا تھا۔ سامنے ٹی وی پر کارٹون سیریل چل رہا تھا۔ دوسری جانب دانش اور سعدیہ بیٹھے تھے۔ وہ آتے ہی غصے سے چلائی۔

''میں نے تم کو یہاں آنے سے منع کیا تھا نا اور بتایا تھا کہ خالہ سے جھگڑا ہوا ہے، بس چلو یہاں سے۔''

''ملائی کھا لیتا ہوں اور چلتا ہوں۔ سوری امی، میں بھول گیا کہ جھگڑا ہوا ہے۔ تم بھی بھول جاؤ امی، پلیز۔''

حارث کی معصومیت بھری بات سنکر نادیہ کا غصہ ایک دم سے ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ مسکرانے لگی۔

کاش ہم سب بھی بچوں سے سبق لیکر اپنے اپنے جھگڑے بھول جائیں تو ہمارے معاشرے میں بہار ہی بہار ہو۔

☆☆☆

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ، دہلی۔ مارچ ۲۰۱۳ء)

دوستی

شکیل کودتا پھاندتا مستی کرتا ہوا اسکول سے گھر آرہا تھا کہ اچانک رک گیا۔

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

چیں چیں...... چیں چیں۔

کہیں پاس سے آواز آرہی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے گھر کی چہار دیواری کے قریب سے چڑیا کی آواز آرہی تھی۔ وہ سڑک کنارے کھلے نالے کو پھاندتا ہوا جھاڑی تک پہنچا۔ چیں چیں .... چیں چیں، چڑیا مسلسل شور مچائے جارہی تھی۔ شکیل نے دیکھا ایک خوبصورت چڑیا کانٹے دار جھاڑیوں میں بری طرح پھنسی ہوئی ہے، اس کے پیروں میں دھاگا الجھا ہوا ہے۔ شکیل کو دیکھتے ہی اس نے پر پھڑ پھڑائے مگر اڑ نہ سکی۔ اس کے پیر جھاڑیوں میں اور الجھ گئے۔ چڑیا کو پکڑنے کا موقع پا کر وہ خوش ہو گیا۔ اس نے اپنے اسکول بیگ کو کندھے کے سہارے پیٹھ پر کس لیا۔ جھک کر چڑیا کے نرم ملائم خوبصورت پروں کو سہلایا۔ اسے بہت مزہ آیا البتہ چڑیا اب زور زور سے چہچہانے لگی۔ شکیل نے بڑی احتیاط سے چڑیا کو جھاڑیون سے نکالا۔ حالانکہ کانٹوں سے وہ اپنی انگلیوں کو بچا نہیں پایا۔ وہ خوشی سے جھومتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ چڑیا کی چہچہاہٹ ڈرائنگ روم میں پھیل گئی۔ آواز سنکر شکیل کی ماں آئی۔ اسکے ہاتھ میں معصوم پرندے کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ وہ

کچھ پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ شکیل بول پڑا۔

''اسکول سے آرہا تھا کہ یہ چڑیا اپنے کیمپس کے باہر جھاڑیوں میں پھنسی ملی۔ میرا ساتھی رینکو کہتا ہے کہ چھوٹی چڑیا کا گوشت بڑا مزیدار ہوتا ہے۔ ممی اس کو ذبح کرکے بناؤ۔'' اسکی آنکھوں میں چمک اور منہ میں پانی بھر آیا۔

حمیدہ نے اس کی گرفت میں چھٹپٹاتی ہوئی چڑیا کو غور سے دیکھا۔ اس کے پر بہت خوبصورت تھے، اس پر سرمئی رنگ کی دھاریاں اور بھی دلکش تھیں۔ اس نے شکیل سے چڑیا لے لیا اور اس کا معائنہ کرنے لگی۔ چڑیا کے دبلے پتلے پیر میں لال نشانات ابھرے ہوئے تھے، ایک دو قطرہ خون بھی رس رہا تھا، پنکھ کے کچھ بال بکھرے تھے۔ اس نے پنکھ پھیلا کر دیکھا، اس کے منہ سے اف! نکلا۔ بازو کا ایک حصہ سوج گیا تھا۔

حمیدہ نے شکیل سے کہا۔ ''تمہارے لئے بازار سے گوشت منگوا دیتے ہیں اور اس زخمی پرندہ کا علاج کرتے ہیں۔''

شکیل اسی پرندہ کا گوشت کھانے کی ضد کرنے لگا۔ حمیدہ نے سمجھایا۔

''یہ بھی تمہارے طرح جاندار ہے۔ ننھی منی ہے اور کمزور بھی، زخمی بھی ہے۔ ہماری ذرا سی ہمدردی سے اس کی جان بچ جائے گی اور تمہیں ایک اچھا دوست مل جائے گا۔ دیکھو یہ تمہاری طرف ہی دیکھ رہی ہے۔''

شکیل نے قریب آکر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے فرسٹ ایڈ باکس لانے کے لئے چلا گیا۔ چڑیا کی مرہم پٹی کی گئی اور ڈرائنگ روم کے ایک

کنارے اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل پا رہی تھی۔ اب شکیل بسکٹ اور کیک کے ٹکڑوں سے اسکی مہمان نوازی کرنے لگا۔ دوسرے ہی دن وہ پھدک پھدک کر صوفے کے ہتھے پر بیٹھنے لگی اور اگلے ہی دن اپنا پر تول کر کمرے میں چکر لگانے لگی۔ شکیل اسکول سے لوٹا تو اسے کمرے میں قلابازیاں کرتا ہوا دیکھ کر خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگا۔ چڑیا چہچہاتی ہوئی اس کی ہتھیلی پر جا بیٹھی۔ وہ کبھی شکیل کے سر پر چکر لگاتی تو کبھی کندھے پر آ بیٹھتی۔ یہ کھیل چل رہا تھا کہ اچانک کمرے میں ایک بلّی آ گئی۔ پھر کیا تھا، چیں.... چیں کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ چڑیا کمرے کے اندر ایک چکر لگا کر باہر نکل گئی۔ شکیل بھی تیزی سے باہر آیا۔ چڑیا جوہی کی شاخ پر جا بیٹھی تھی اور مسلسل چہچہا رہی تھی۔ شکیل وہاں پہنچا تو پھدک کر اس کی ہتھیلی پر آ گئی۔

بلّی کو دیکھنے کے بعد سے چڑیا اس کمرے کے اندر نہیں جاتی تھی۔ شکیل اسکول جانے سے پہلے اور چھٹی کے بعد احاطے کے اندر اس کے ساتھ کھیلتا۔ حمیدہ دونوں کی دوستی پر خوش رہنے لگی۔ وقت گزرتا رہا۔

گرمی کی ایک دوپہر شکیل اسکول سے نہیں لوٹا تھا کہ چڑیا ڈرائنگ روم میں چکر لگاتی چیں چیں کرنے لگی۔ حمیدہ نے سمجھا شاید شکیل کو تلاش کر رہی ہے۔ مگر چڑیا لگاتار چہچہاتی رہی یہاں تک کہ حمیدہ کے کمرے میں جا پہنچی۔ کبھی حمیدہ کے سر پر منڈلاتی، کبھی دروازے کی جانب اڑتی اور بغیر دم مارے چیں چیں کئے جا رہی تھی۔ حمیدہ کو شک ہوا شاید کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ وہ باہر آئی، چڑیا اس کے آگے آگے چیں چیں کرتی چہار دیواری کے باہر نکلی۔ حمیدہ اس کے پیچھے تھی۔ سڑک کنارے

نالے کے پاس چڑیا زمین پر اُتر آئی اور ذرا زور سے چہچہانے لگی۔حمیدہ نے اس کی چہچہاہٹ کے بیچ شکیل کی آواز نالے کے اندر سے سنی۔

شکیل کو سڑک کنارے اچھلتے کودتے چلنے کی بری عادت تھی۔اس لئے وہ پھسل کر نالے میں گر گیا تھا۔چوڑے نالے میں وہ سینے تک ڈوبا ہوا تھا۔حمیدہ نے بڑی مشکل سے اس کو باہر نکالا۔چڑیا اب خاموش تھی۔

نالے کی گندگی سے شرابور شکیل اسے ہاتھوں میں لیکر چومے جا رہا تھا۔حمیدہ ننھی چڑیا کی دوستی دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھی۔

پیارے بچو! معصوم پرندوں سے ہمدردی اور دوستی کرنی چاہئے۔

☆☆☆

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ، دہلی۔نومبر ۲۰۱۳ء)
(زبان و ادب، پٹنہ، اکتوبر ۲۰۱۳ء)

نیک کام

حامد سر جھکائے امّی کی ڈانٹ سنتا رہا۔ وہ کاپی سامنے رکھے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے پاس پنسل نہیں تھی اور ہوم ورک کرنا تھا۔ ابھی ایک دن قبل ہی اس کو نئی پنسل دی گئی تھی اس کے پاس نہیں تھی۔ پنسل کے بارے میں امّی کے پوچھنے پر وہ کچھ بتا نہیں رہا تھا۔ اس کی پر اسرار خاموشی اور پنسل برباد کرنے کی وجہ سے امّی اس کو ڈانٹ رہی تھیں۔ حامد جب سِسکنے لگا تو ابّو نے بڑی محبت سے چپ کرایا اور ایک پنسل تھمائی۔

حامد ہوم ورک میں منہمک ہو گیا اور ابّو اس کے سامنے بیٹھے مسکراتے رہے۔ ہوم ورک پورا کرنے کے بعد اس نے کاپی بند کی اور دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے باہر نکل گیا۔

مغرب کے بعد اسے گھر کا ماحول بدلا بدلا سا لگا۔ امّی نے مسکرا کر سبق یاد کرنے میں مدد کی۔ دن کا غصّہ کہیں بھی ان کے چہرے پر نہیں تھا۔ ابّو بھی دلجوئی کر رہے تھے۔ اسے اچھا لگا اور اطمینان سے پڑھتا رہا۔ عشاء کے بعد دستر خوان سجایا گیا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا جب اس نے دستر خوان پر اپنی پسند کے کھانے دیکھے۔ اس نے مسکرا کر امّی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے بھی مسکرا کر خوش باش کہا۔ دستر خوان پر آپس میں باتیں ہونے لگیں۔ گفتگو کے دوران ابّو نے حامد سے پوچھ لیا۔

"حامد میاں، آج کل آپ کی پنسل کو کیا ہو رہا ہے، اکثر آپ کے بستے سے غائب ہو جاتی ہے"۔ حامد کا نوالہ جیسے گلے میں اٹک گیا ہو۔ وہ خاموش رہا تو ابّو نے سمجھایا۔

"مدرسہ میں لکھائی کے بعد احتیاط سے پنسل کو بستہ میں رکھ لینا چاہئے اور چھٹی کے وقت دیکھ لیا کیجئے اس میں پنسل ہے کہ نہیں"۔

امّی نے حامد کو خاموش پایا تو نرمی سے بولیں۔

"اگر کچھ گم ہو جائے یا کوئی کچھ لے لے تو ہمیں بتانا چاہئے، ہم سب آپ کی بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں، آپ صورت حال سے واقف نہیں کرتے ہیں تو ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔"

حامد کا نازک دل والدین کی باتیں سن کر گرویدہ ہو گیا۔ اب خاموش رہنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

"امّی مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے اپنی پنسل علیم کو دے دی ہے۔ دو دن سے پنسل نہیں رہنے کی وجہ سے مولانا صاحب اس کی پٹائی کر رہے تھے۔ وہ غریب ہے مگر سبق فر فر سناتا ہے۔ وہ میرا دوست ہے۔ مجھے آپ تھوڑا ڈانٹ کر نئی پنسل دے دو گی یہی سوچ کر میں نے اسے......"

آپ کو پہلے بتا دینا چاہئے۔ ہم لوگ کیا کیا سوچتے رہے۔ ساتھی کی مدد کر کے آپ نے نیک کام کیا ہے، اس کا اجر ضرور ملے گا۔" مسکراتے ہوئے حامد کے ابّو بولے۔ فرطِ محبت سے مسکراتی ہوئی امّی نے حامد کو سینے سے لگا لیا اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

☆☆☆

نصیحت

شام ہوتے ہی محلّے میں پٹاخے چھوٹنے لگتے اور آتش بازی شروع ہو جاتی۔ کوئی ایک پٹاخے میں آگ لگاتا، زوردار آواز ہوتی اور سبھی بچے تالیاں بجانے لگتے۔ ایک شور برپا ہو جاتا۔ حکیم صاحب محلّے کے بچّوں کو اس طرح اودھم مچاتے دیکھتے تو انہیں افسوس ہوتا۔ دینو کے بیٹے نے جب سے بستی میں پٹاخے کی دکان سجائی تھی تب سے شام ڈھلتے ہی چین وسکون غارت ہو جاتا تھا۔ وہ دن ڈھلتے ہی اپنے گھر کے باہر تخت پر پٹاخے اور پھلجھڑیاں سجا دیتا تو بچے اسے خریدنے کو مچلنے لگتے۔

کافی غور وفکر کے بعد مسجد سے لوٹتے ہوئے حکیم صاحب دینو کے دروازے پر پہونچے۔ خیر وعافیت دریافت کی اور دینو کو سمجھاتے ہوئے بولے۔

"دینو محلّے میں پٹاخے کی دکان کھولنے سے کتنی پریشانی ہو رہی ہے تم جانتے ہو، بھائی! کمانے کے اور بھی راستے ہیں۔ تمہارے بچّے کی عمر پڑھنے لکھنے کی ہے تم نے اسے کام میں لگا دیا وہ بھی پٹاخے بیچنے میں۔"

"نہیں چاچا، یہ تو دلی میں تھا، ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا ابھی گھر آیا ہے تو بازار سے کچھ پٹاخے لا کر بیچ رہا ہے اس میں برائی کیا ہے؟" دینو نے جواب دیا۔

"میں تو بس نصیحت کرنے چلا آیا تھا کہ محلّے میں پٹاخے کی وجہ سے پڑھنے لکھنے والے بچّوں کو دقت ہوتی ہے۔ پھر ہمیں کو دیکھو نا، بم کی طرح آواز سے میرا پورا بدن کانپ جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس سے پھونس کے گھر میں آگ لگ جائے، یا کوئی زخمی ہوجائے۔" حکیم صاحب نرمی سے بولے۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا چاچا، اب تو بچّے بھی ہشیار ہوگئے ہیں اور پٹاخے وغیرہ سے کیا ہوگا۔ آپ اطمینان رکھئے، ایسا ویسا کچھ نہیں ہوگا۔" دینو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

حکیم صاحب نے لمبی سانس لی اور وہاں سے واپس ہوتے ہوئے گویا التجا کی۔ "دینو تمہاری یہ دکان بھلے ہی تم کو نفع دے مگر محلّے میں سوائے نقصان کے کچھ نہیں۔ دیکھنا سمجھ میں آئے تو اپنے بیٹے کو کسی اور کام میں لگا کر ہم سب کو اس مصیبت سے نجات دلا دینا۔"

حکیم صاحب چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ ایک طاقت ور پٹاخے کی آواز فضا کو دہلا گئی۔ وہ کانپتے ہوئے بڑی مشکل سے گرتے گرتے بچے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دینو کے بیٹے کو دیکھا جو قہقہہ لگا رہا تھا۔ افسردہ ہوکر حکیم صاحب نے اپنا مطب کھولا اور مریضوں کو دیکھنے لگے۔ مگر ان کا دل آج کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار انکی آنکھوں کے سامنے دینو کے بیٹے کی دکان اور گلیوں میں آتش بازی کرتے بچّے آجاتے تھے۔ انہوں نے جلدی ہی مطب بند کیا اور تھکے قدموں سے گھر واپس آگئے۔

اب دیر رات بھی پٹاخے پھٹنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ بچّوں کا شور وغل اور آتش بازی جاری تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اب یہ آوازیں معمول بن چکی ہوں۔

ہفتہ بھر بعد حکیم صاحب عشاء کی نماز کے لئے مسجد جانے کو تیار ہورہے تھے

کہ کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ انہوں نے دروازہ کھولا سامنے دینو کو کھڑا پایا تو سکتے میں آ گئے۔ انجانے خوف نے انہیں جکڑ لیا۔ دینو روتے ہوئے فریاد کر رہا تھا۔

"چاچا ذرا جلدی چلیئے، میرا بیٹا جل گیا ہے حکیم چاچا۔" "یہ کیسے ہوا؟" حکیم صاحب نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ اپنی دکان سمیٹ رہا تھا کہ لیمپ پٹاخے پر گر گیا۔ جلدی جلدی پٹاخے سمیٹنے لگا کہ دھڑام دھڑام پٹاخ پٹاخ سبھی پٹاخے اور پھلجھڑیاں ایک ساتھ جل اٹھیں اور وہ بیہوش ہو کر وہیں گر پڑا۔ بس آپ جلدی چلیئے۔"

حکیم صاب نے اپنا بیگ سنبھالا اور بلکتے ہوئے دینو کے ساتھ تیزی سے چل پڑے۔

☆☆☆

مراد کی سمجھداری

جبرو کچھ ہی دنوں پہلے یہاں آیا تھا۔ اس کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ وہ بہت محنتی اور پھرتیلا تھا، گاہک کا کام جھٹ سے کر دیتا۔ اب اسکول کے بغل والی دکان کا مالک رشید میاں صرف بیٹھے بیٹھے حکم دیتے رہتے اور جبرو سارے کام کرتا رہتا۔ وہ اتنے کم وقت میں ہی دکان پر آنے جانے والوں کا چہیتا بن گیا تھا۔ کام میں مصروف رہنے کے باوجود وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا۔

رشید میاں کی دکان پر بچے اکثر کچھ نہ کچھ خریدنے کے لئے آتے رہتے۔ کوئی شکر پارہ لیتا تو کوئی بسکٹ، کوئی سنیکس تو کوئی گول گول نمکین چاکلٹ لیتا۔ پنسل، ربڑ، شارپنر اور کاپیاں بچے یہیں سے خریدتے۔ گھریلو سامان لینے کے لئے بھی دو چار خریدار یہاں آتے رہتے۔ جبرو جلدی جلدی سامان نکالتا اور خریداروں کے حوالے کرتا رہتا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس کو مسکراتا ہوا دیکھ کر مراد احمد متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔

مراد احمد کو اسکول سے آتے جاتے جب بھی وقت ملتا جبرو سے ملنے دکان پر چلا جاتا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ صرف مراد ہی جانتا تھا کہ جبرو کا اصلی نام جبیر الحسن ہے اور وہ یتیم ہے۔ اس سے پہلے وہ شہر میں ایک چائے کی دکان پر کام کرتا تھا۔ یہ سب باتیں جبرو نے اسے بتائی تھیں۔ جبرو کو جب بھی

فرصت ملتی وہ اسکول کے گیٹ پر کھڑا ہو جاتا اور میدان میں کھیلتے کودتے بچوں کو ایک ٹک دیکھتا رہتا اور مسکراتا رہتا۔ یہاں تک کہ رشید میاں چلا کر اسے بلا لیتے۔

مراد سے اب اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ مراد کے کپڑوں کو چھوتا، بستہ سے کتابیں نکال کر اس میں کی تصویریں دیکھتا۔ لیکن جیوں ہی رشید میاں کی آواز سنائی پڑتی، اس کا معصوم چہرا کمہلا جاتا اور وہ بھاگتا ہوا دکان کے اندر ہوتا۔ دکان میں ہونے کے باوجود اس کی نگاہ آتے جاتے بچوں پر رہتی اور اسے جب بھی فرصت ملتی وہ اسکول کے سامنے کسی نہ کسی بچے کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو جاتا۔ بچے بھی اس کی باتوں کو مزے لے کر سنتے۔ باتیں کیا ہوتیں، خریداروں اور رشید میاں کی نقلیں اتاری جاتیں یا چٹکلے ہوتے۔ مراد اس کا بے حد خیال رکھنے لگا تھا۔ لیکن وہ جب اپنے ٹفن سے کچھ دینا چاہتا وہ مسکرا کر پیٹ بھرا ہونے کا بہانہ بناتا۔ مراد اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسو دیکھ کر اداس ہو جاتا۔

ادھر پچھلے چند دنوں سے جبرو ست دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس کی چہل بازی اور ہنسی مذاق میں بہت کمی آگئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اب خاموشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ مراد اس کی وجہ جاننا چاہتا تو وہ بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا اور رشید میاں کی طرف دیکھتا ہوا دکان کے اندر چلا جاتا۔ لیکن مراد بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ کافی کوششوں کے بعد جبرو نے زبان کھولی۔

"دکان کے بعد آج کل گھر پر بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ بہت تھک جاتا ہوں۔ رات میں بدن تپتا رہتا ہے، کمزوری لگتی ہے۔ باقی سب ٹھیک ہے......"

مراد اب تک اس کی مجبوریوں کو سمجھ چکا تھا۔ وہ جبرو کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر وہ

اپنی ہی دنیا میں مست رہتا۔ مراد کی کتابیں پلٹتا، اس کے لباس کی تعریف کرتا، چٹکلے سناتا۔ وہ جب تک مراد کے ساتھ ہوتا خوب خوش رہتا۔ چاہتے ہوئے بھی مراد اس کی مدد کی تدبیر نہیں نکال سکا۔

مراد کی فکرمندی بڑھ گئی تو اس نے اپنے ٹیچر جی سے بات کی۔ غریب اور نادار بچوں کی دیکھ بھال اور سرپرستی کرنے والے اداروں کے بارے میں معلومات حاصل کی۔ ٹیچر جی نے اس طرح کی جانکاری کی وجہ پوچھی تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن وہ من ہی من جبرو کے بارے پروگرام بناتا رہا۔

اسکول سے چھٹی ہوئی، بچے شور کرتے باہر آئے۔ مراد بھی اپنے دوستوں کے ساتھ گیٹ سے نکلا۔ اس نے دیکھا، رشید میاں کے ہاتھ میں چپل ہے اور وہ بڑی بے رحمی سے جبرو کی پٹائی کئے جا رہے ہیں۔ وہ بلک رہا ہے۔ مراد کو یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ جبرو اسکول کی چھٹی کے وقت عادت کے مطابق گیٹ پر آ گیا ہوگا۔ اتنی چھوٹی سی بات پر اس کی پٹائی سے مراد پریشان اور خوف زدہ ہو گیا۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا گھر پہنچا لیکن جبرو کا روتا ہوا چہرا بار بار اس کی نگاہوں میں آ جاتا۔ گھر آتے ہی اس نے دیکھا، امی جان باورچی خانہ میں ناشتہ تیار کر رہی ہیں اور پاپا کورٹ سے واپس نہیں آئے ہیں۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور کمرے میں رکھا ہوا ٹیلی فون سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسکی امی جان وہاں آئی تو انہوں نے صرف اتنا سنا۔

’’جی، میرا نام مراد احمد اور میرے پاپا کا نام احمد علی ایڈوکیٹ ہے۔ جی، میں مڈل اسکول چندن پور میں پڑھتا ہوں، جی، جی۔‘‘

اس واقعہ کے بعد دو دن تک وہ اسکول نہیں گیا۔ والدین پوچھتے تو وہ سر درد کا

بہانہ کر جاتا۔ وہ اندر سے کافی پریشان تھا۔ ایسے میں پاپا کے ساتھ اسکول آنے کا حکم اس کے لئے مصیبت سے کم نہ تھی۔ اب اسکول جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ پاپا کے ساتھ اسکول پہنچا۔ وہاں ایک گاڑی کھڑی تھی اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے چیمبر میں دو تین نئے لوگ بیٹھے تھے۔ وہ ڈرتے ڈرتے کلاس روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے سبھی بچوں کو میدان میں جمع ہونے کا اعلان کیا۔ بچے قطار میں کھڑے ہو گئے تو مہمانوں میں سے ایک نے بلند آواز میں بتایا۔

"پیارے بچوں! آج ہم لوگ آپ کے اسکول میں مراد احمد نام کے طالب علم کو انعام دینے آئے ہیں۔ انہوں نے ایک مجبور اور یتیم بچے کو مزدوری کرنے اور اس پر ہو رہے ظلم سے بچایا۔ مراد نے سمجھ داری سے کام لیا اور ہمت کر کے فون سے ہمیں 'جبرو' کے بارے میں بتایا اور اس کی مدد کرنے کی درخواست کی۔ ہم لوگوں نے جبرو کو رشید میاں کے چنگل سے آزاد کیا اور آواسیہ ودیالیہ میں بھرتی کر دیا ہے، جہاں وہ پڑھے لکھے گا اور آپ لوگوں کی طرح ایک اچھا انسان بن سکے گا۔"

انہوں نے مراد کو سامنے بلایا اور پھر مخاطب ہوئے۔ "بچوں! مراد احمد کی سمجھ داری اور بہادری کے لئے شاباشی اور آپ سب کے لئے نصیحت ہے کہ مصیبت اور پریشانی سے گھرے لوگوں کی مدد کرنی چاہیے۔"

مہمان کی بات ختم ہوئی اور اسکول تالیوں کی آواز گونج اٹھا۔

☆☆☆

نانی کی بکری

عرفان گرمی کی چھٹیاں بتانے اپنی نانی کے گاؤں آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ یہاں کب آیا اُسے کچھ یاد نہیں۔ اس کی امی نے بتایا کہ جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا تب نانی کے یہاں کچھ دنوں رہا تھا۔ اب وہ آٹھ سال کا ہو چکا تھا اور گاؤں آنے سے کافی خوش تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ اس نے ماموزاد بھائی ریاض سے دوستی کر لی جو اس کا ہم عمر تھا۔ ریاض نے اسے سارا گھر دکھایا۔ بڑے بڑے کمرے، کمروں کے ساتھ کشادہ برآمدے، چہار دیواری سے گھرا ہوا کشادہ آنگن اور آنگن کے کنارے چھوٹے بڑے پیڑ پودے۔ سب سے آخر میں پھونس کا بڑا کمرا۔ ریاض نے اسے لیچی اور نیبو کے پیڑ دکھائے۔ اس نے چھوٹے بڑے نیبو سے لدے ہوئے جھاڑی دار پیڑ کو دیکھا۔ اس کا جی للچایا اور منع کرنے کے باوجود ایک نیبو توڑ لیا تو ریاض نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ابھی پھل چھوٹا ہے، کچھ اور بڑا ہو جائے تو یہ رس دار ہو جاتا ہے۔ ابھی اسے کاٹ کر دیکھو ایک دو بوند رس نہیں نکلے گا۔''

عرفان اس کا منھ تکتا رہا۔ اس نے دہلی میں اپنے مکان کے آس پاس اتنے پیڑ پودے نہیں دیکھے تھے۔ البتہ جب وہ پارک جاتا تو ہریالی سے لطف اندوز

ہوتا۔ ریاض نے نیبو کو دو ٹکروں میں کاٹا اور نچوڑ کر اسے دکھایا، واقعی ایک بوند بھی رس نہیں نکلا۔ عرفان نے کنارے بنی پھونس کی جھونپڑی کے بارے میں پوچھا تو ریاض نے بتایا کہ یہ بکریوں کا گھر ہے۔ وہ خوش ہو گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ جھونپڑی خالی تھی۔ اس نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے جھوٹ کیوں بولا؟ میں نے تم کو دوست بنایا ہے اور میں دوستوں سے جھوٹ نہیں بولتا۔''

ریاض کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''تم تھوڑے بیوقوف ہو، پھوپھی جان تو کہتی ہیں کہ تم کلاس میں فرسٹ آتے ہو۔ لیکن ہو تم بدھو۔ ارے بھائی ابھی دن کے دس بجے ہیں، بکریوں کو لیکر رحمت بوا کھیتوں کی طرف گئی ہیں۔ وہ دوپہر کو آئیں گی تو ہو سکتا ہے گوری کو ساتھ لائیں۔ باقی بکریاں شام کو آئیں گی اور اس جھونپڑی میں باندھی جائیں گی، اب سمجھے۔''

دونوں بات چیت کرتے ہوئے مکان سے باہر آئے۔ سڑک سے اونچا ایک ہال نما بڑا دالان اور اس کے سامنے کھلی جگہ۔ دونوں دالان میں داخل ہوئے اور لکڑی کی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ ریاض نے اسے بتایا کہ یہ مہمان خانہ ہے۔ ابھی دونوں باتیں کر رہے تھے کہ سامنے سے رحمت بوا آتی دکھائی پڑیں۔ اس کے ساتھ ایک بکری بھی تھی۔ ریاض بول پڑا۔ ''دیکھو دیکھو وہ آئی گوری۔''

نانی جان کی بکری گوری، بہت خوبصورت تھی۔ بالکل سفید صرف گردن میں ایک چوڑی دھاری جیسے کسی نے کالے ریشم کی پٹی باندھ دی ہو۔ نوکیلا اور پیچھے کی

طرف مُڑا ہوا سینگ، لمبے لمبے کان اور بھرا بھرا جسم۔ عرفان نے قریب جا کر اسے چھوا۔ گوری نے مڑ کر اسے دیکھا۔ اسکی پیاری نیلی نیلی آنکھوں میں پیار امڈ آیا۔ عرفان کو اچھا لگا۔ وہ اس کی گردن سے لپٹ گیا۔ گوری نے کوئی مزاحمت نہیں کی البتہ گردن اٹھا کر اسے دیکھا جیسے پسندیدگی کا اظہار کر رہی ہو۔ عرفان بہت خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی جانور کو گلے لگایا تھا۔ گوری بھی کوئی مخالفت نہیں کر رہی تھی۔ پھر پتہ نہیں عرفان کو کیا سوجھا۔ اس نے اس کے دونوں سینگ کو کس کر تھام لیا اور کھینچنے لگا۔ گوری نے پہلے تو اپنا سر جھکا دیا مگر عرفان لگاتار اس کی سینگ سے زور آزمائی کرتا رہا تو اس نے عرفان کو زور سے جھٹک دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے گر گیا۔ ریاض نے اسے سنبھالا اور گوری کے سینگ سے کھیلنے کو منع کیا۔

عرفان کو گوری کی یہ حرکت ناگوار گذری۔ وہ اس وقت خاموش رہا۔ دونوں اندر آ گئے لیکن کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک چھڑی لیکر باہر آ گیا۔ گوری دالان کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ اسکی پٹائی کرنے لگا۔ اس نے دو چار چھڑیاں تابڑ توڑ رسید کر دیں۔ گوری ممیاتی ہوئی تیزی سے بھاگی اور اندر جانے کے بجائے سڑک کی راہ پکڑ لی۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہو گئی تب عرفان کو انجانے خدشات نے آ گھیرا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ لیکن وہ کسی سے اس بارے میں کہنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کہیں گوری کی پٹائی کے سبب ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں شام ہونے کو آئی۔ وہ پریشان تھا اور اس کے ذہن میں گوری کا سراپا گھوم رہا تھا۔

نانی جان نے اسے شام کی چائے کے لئے بلایا۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ

اور چائے سے فارغ ہوکر دروازے پر آیا۔اب نانی کی بکریاں آنگن اور دروازے پر گھومتی ہوئی دکھائی پڑیں مگر اس میں گوری نہیں تھی۔عرفان نے ریاض کو سارا واقعہ سنایا۔تھوڑی دیر کے لئے وہ بھی پریشان ہوا مگر گوری کو ڈھونڈنا ضروری تھا۔دونوں چپکے سے نکل پڑے۔گاؤں کی کچی سڑک کچھ ہی دوری کے بعد کھیتوں کی پگڈنڈی میں تبدیل ہوگئی۔اونچے میڑھ پر کھڑے ہوکر دونوں نے چاروں طرف دیکھا لیکن گوری دکھائی نہیں پڑی۔دونوں آگے بڑھے۔بانس کی جھاڑیوں میں دیکھا، وہاں بھی ناکامی۔عرفان کو اب ندامت ہورہی تھی کہ اس نے بے کار ہی گوری کی پٹائی کی۔وہاں سے مایوس ہوکر ریاض تالاب کی جانب چلا۔تالاب کنارے درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ۔درختوں کے طویل سائے اب ڈراونے لگ رہے تھے۔ہوا کے دوش پر جھولتی ٹہنیاں اور پتوں کی سرسراہٹ خوف کا احساس دلا رہی تھی۔گوری وہاں بھی نہیں ملی۔اب ریاض ناامید ہو چلا تھا اور عرفان کی حالت تو قابل دید تھی۔دونوں کو واپس ہونے کی بھی جلدی تھی کہ گھر پر ان کی تلاش ہو رہی ہوگی۔اندھیرا پھیل چکا تو دونوں گھر واپس ہوئے۔ سبھی انتظار کر رہے تھے، آتے ہی سوالات کی بوچھار شروع ہوگئی۔دونوں سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔عرفان پریشان تھا کہ گوری نہیں ملی تھی۔وہ کسی سے بتانے میں بھی ڈر رہا تھا۔آخر کار اس نے نانی جان کو بتانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ وہ رحمت بوا سے گوری کی تلاش کرالیں گی۔

وہ سیدھا نانی کے کمرے میں پہنچا اور ان کے گلے لگ گیا۔انہوں نے

بھی پیشانی چوم کر پیار کا اظہار کیا۔نانی جان نے گاؤں میں پہلے دن طبیعت لگنے کے بارے میں پوچھا تو اس نے دوپہر سے اب تک کا واقعہ سنا ڈالا۔پھر بڑی ہی معصومیت سے بولا۔ ''پتہ نہیں گوری کہاں چلی گئی ہے،نانی جان اسے تلاش کرائیے۔''

نانی جان مسکراتی ہوئی بولی۔''ہمارے لئے اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ تمہیں اپنی نادانی کا احساس ہوگیا ہے۔''

''نہیں نانی جان !جب تک گوری مل نہیں جاتی مجھے سکون نہیں ملے گا۔'' عرفان نے عاجزی سے کہا۔نانی جان نے فوراً رحمت بوا کو طلب کیا اور گوری کے بارے میں پوچھا۔اس نے بتایا کہ آج نہ جانے کیوں وہ شام سے بہت پہلے بارے (بکری کے لئے بنایا گیا گھر) میں جا کر دبک گئی تھی۔ضرور اس بے زبان کو کسی نے مارا ہوگا۔'' رحمت بوا کی باتیں سنکر عرفان کو اور بھی پشیمانی ہوئی۔

وہ دوبارہ نانی جان سے لپٹ گیا اور وعدہ کیا کہ اب کسی بھی جانور کو نہیں ستائے گا۔دوسرے دن سے ہی اس نے گوری اور دوسری بکریوں کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔اس کی چھٹیاں ختم ہوئیں۔اب وہ دہلی واپس آچکا ہے لیکن وہ جب بھی گاؤں فون کرتا ہے ریاض سے گوری کے بارے میں ضرور پوچھتا ہے۔کیوں کہ اسے سچ مچ جانوروں سے پیار ہوگیا ہے۔

☆☆☆

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ،دہلی۔مارچ ۲۰۱۳ء)

اچھی لڑکی

زہرا بہت خوبصورت تھی۔ اسکی عمر کوئی دس گیارہ سال ہوگی لیکن سجنے سنورنے کا شوق کچھ زیادہ ہی تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کا فائدہ اٹھاتی اور ساری خواہشیں پوری کروا کر ہی دم لیتی۔ قیمتی کپڑے اور زیورات پر وہ تو فریفتہ تھی۔ سونے کا ٹاپس اور گلے میں ہار، بدلتے رہنا اس کا معمول تھا۔ چھٹیوں میں گاؤں آتی تو ہم عمر لڑکیوں سے گھری رہتی۔ اس کے والد شہر میں سرکاری ملازم تھے اس لئے گاؤں میں خوب آؤ بھگت ہوتی۔ دادا دادی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ اسی وجہ کر وہ تھوڑی ضدی بھی ہوگئی تھی۔ لیکن گاؤں کی سہیلیوں میں بہت مقبول تھی۔ یہ بھی عجیب تھا کہ اسے نعمت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ خاص طور سے جب نعمت اس کے کپڑے، کھلونے اور زیوروں کو نہارتی۔ اسے اپنے یہاں کام کرنے والی اس لڑکی کا یہ رویہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اسے اکثر اپنے کمرے سے چلے جانے کو کہہ دیتی۔ اسے ہمیشہ یہ خدشہ لگا رہتا کہ نعمت کہیں اس کے سامان چرا نہ لے۔ وہ اس غریب لڑکی سے من ہی من نفرت کرتی تھی۔ زہرا دن بھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کبھی گھر میں، کبھی لان اور کبھی مکان کے پچھوارے اور لیچی کے باغ میں کھیل کود میں مصروف رہتی۔ زہرا کے دادا بستی کے بڑے کسانوں میں سے تھے۔ ان کی کھیتی مکان کے سامنے دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

زہرا کبھی کبھی ادھر بھی نکل پڑتی۔ لان کے کنارے سرو کے درخت کے نیچے گڑیا گڑیوں کا بیاہ رچاتی اور آپس میں ٹافیاں بانٹتی۔ ضرورت پڑنے پر وہ نعمت کو آواز دیکر چھوٹے موٹے کام ضرور کرواتی مگر جیسے ہی کام پورا ہو جاتا اسے واپس بھیج دیتی۔ ایسا اس لئے ہوتا کہ نعمت اپنی ہم عمر بچیوں کو کھیلتے دیکھ کر اس طرف خاصی متوجہ ہو جاتی اور یہ بات زہرا کو ہرگز پسند نہیں تھی۔

موسم گرما کی تعطیل تھوڑی طویل ہوتی ہے لیکن زہرا کے لئے یہ چھوٹی پڑ جاتی۔ وہ سہیلیوں کے ساتھ روز نئے پروگرام بناتی۔ اس دفعہ وہ باغیچہ اور کھیتوں میں سیر کو ترجیح دے رہی تھی۔ ایک سہ پہر کو جب درختوں کے سائے بہت طویل ہوگئے اور لان سے بڑھ کر کھیتوں تک پھیل گئے تو زہرا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ مٹر کے کھیت میں جا پہنچی۔ مٹر سے پورا کھیت اٹا ہوا تھا۔ وہ اور اس کی سہیلیوں نے ہرے اور تازہ مٹر کے دانے چبائے اور کچھ دیر وہیں مٹر گشتی کرتی رہی۔ پھر اس نے باغیچے میں چلنے کا پروگرام بنایا جہاں کھیرے کی لتیاں بانس پر پھیلی ہوئی تھیں اور ایک دو پھل اس سے نیچے لٹک رہے تھے۔ تینوں وہاں سے چلے، ابھی باغ کے قریب آئے ہی تھے کہ سامنے سے متوالا سانڈ جھومتا دوڑتا اِدھر آتا دکھائی پڑا۔ تینوں پلٹ کر بھاگے۔ زہرا نے اونچے ہیل کی چپل پہن رکھی تھی، دوڑنے میں خود کو سنبھال نہ سکی اور اوندھے منہ کھیت میں جا گری۔ سانڈ کے خوف سے اس کا پورا بدن پسینے پسینے ہوگیا۔ تبھی کسی نے اس کو کھینچ کر راستے سے الگ کیا۔ سانڈ بس چار قدم ہٹ کر دوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ سامنے نعمت کھڑی تھی۔ زہرا نے جلدی میں اٹھنا چاہا مگر اس کے پیر میں موچ آگیا تھا اور جسم میں کئی جگہ خراشیں بھی۔ نعمت نے کھڑا ہونے میں مدد کی تب تک اس کی دونوں سہیلیاں بھی آ پہنچی۔ دونوں نے اس کو کندھے کا

سہارا دے کر گھر پہنچایا۔

رات آتے آتے زہرا کو بخار نے آدبوچا۔ وہ غنودگی میں بڑبڑاتی رہی۔ اسی حالت میں اس نے کئی دفعہ نعمت کو پکارا۔ صبح تک اس کی طبیعت بحال ہوگئی۔ گھر کے لوگوں کو اطمینان ہوا کیوں کہ اگلے دن زہرا کو شہر لوٹنا تھا۔ ٹھیک ہوتے ہی وہ سب سے پہلے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر کے لئے وہ پریشان ہو اٹھی۔ اس کے گلے کا ہار غائب تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ہار کل کھیت میں گر گیا ہوگا۔ کل کے واقعہ کو یاد کر کے وہ سہم گئی۔ امی نے اسے آرام کرنے کو کہا، اس لئے وہ دن بھر گھر پر رہی۔

واپسی کا وقت آگیا۔ زہرہ کی کئی سہیلیاں ملنے آئیں۔ دادادادی اور پڑوسی چاچا بھی موجود تھے۔ گاڑی بھی آچکی تھی۔ اسی وقت امی نے اسے گلے کا ہار پہناتے ہوئے بتایا کہ کل ہی یہ ہار نعمت نے دیا تھا۔ اسے یہ کھیت سے ملا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ سب سے پیچھے کھڑی نعمت کے پاس پہنچی، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے گاڑی تک لے کر آئی۔ اپنے بیگ سے ایک ڈبہ نکالا اور اسے دیتی ہوئی بولی۔

''نعمت! تم نے میری جان بچائی اس کے لئے شکریہ۔ تم بہت اچھی ہو، اتنی اچھی کہ میں تمہیں اپنا دوست بنالوں۔''

اس نے نعمت کو گلے لگا لیا۔ زہرا کی اس تبدیلی سے نعمت خوش بھی تھی اور حیران بھی اور وہاں موجود سبھی کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔

☆☆☆

پنڈت گوپی ناتھ

گوپی نے دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا۔ پنڈت جی آنکھیں مونڈے تخت پر چت لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے پیروں کے پاس بستہ پڑا تھا لیکن شنکر وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر باہر کھڑا رہا پھر دبے پاؤں اندر چلا گیا۔ اپنا بستہ اور بوری فرش پر رکھ کر باہر آ گیا۔ اس نے ندازہ لگایا کہ پنڈت جی گہری نیند میں ہیں۔ وہ کمرے کے باہر ان کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسے شنکر پیپل کے درخت کے نیچے کھیل کود میں مگن دکھائی پڑا۔ اس نے اشارے سے شنکر کو بلایا مگر وہ نہیں آیا۔ گوپی بار بار اندر جھانک کر پنڈت جی کو دیکھتا، پنڈت جی بے خبر تھے۔ گوپی کو حیرت ہو رہی تھی۔ یہ وقت ان کے سونے کا نہیں تھا۔ ایک دفعہ اس کے دل میں آیا کہ انہیں جگا دیا جائے۔ مگر اس خوف سے کہ کہیں وہ غصہ نہ ہو جائیں اس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

پنڈت دیا کانت مصر سنسکرت پاٹھ شالہ میں ٹیچر تھے۔ سنسکرت اور ہندی زبان پر ان کو مہارت حاصل تھی۔ اچھے معلم تو تھے ہی، تربیت اور اخلاقیات پر بڑی

توجہ دیتے تھے۔ سخت مزاج تھے، ذرا سی شرارت اور حکم عدولی برداشت نہیں کرتے۔ ہونہار شاگردوں کے درمیان عزت واحترام پاتے تھے۔ آبادی سے تھوڑے فاصلے پر آم اور پیپل کے درختوں کے درمیان ان کی رہائش گاہ تھی۔ ایک کمرے کے مکان میں اکیلے رہتے تھے۔ پاٹھ شالہ سے واپس آتے اور تھوڑی دیر آرام کے بعد یہیں بچوں کو پڑھاتے۔ یہ بچے عام طور سے اسکول کے طالب علم ہوتے۔ پنڈت جی دو طرح کے بچوں کو پڑھانے میں دلچسپی لیتے تھے۔ سماج میں اثر ورسوخ اور مالدار گھرانے کے بچوں کو وہ فوقیت دیتے۔ جن سے بغیر طلب کئے ہوئے اچھی آمدنی کی امید ہوتی۔ دوسرے وہ بچے جو ذہین ہوتے جن کی تھوڑی سی مدد کر دینے سے پنڈت جی کی تعلیم کا شہرہ ہوتا۔ ان دنوں ان کے درس میں دونوں طرح کے بچے شامل تھے۔

شنکر گاؤں کے پردھان کا پوتا تھا۔ پڑھنے میں کمزور اور نہایت شرارتی۔ اسکول میں ناک ودم کئے رہتا۔ روز نئی شرارتیں اس کی عادت تھی۔ سارا اسکول اس سے پریشان رہتا۔ پردھان کے گھرانے کی وجہ سے اساتذہ بھی آنکھ موند لیتے۔ پنڈت جی کے درس میں ڈالنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کی تھوڑی بہت تربیت ہو جائے۔ پنڈت جی نے اس کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ وہ پنڈت جی کے درس میں بھی من نہیں لگاتا۔ نت نئے نئے بہانے بناتا، بہانے سے باہر نکل جاتا اور مٹر گشتی کرتا۔ پنڈت جی کے سامنے تخت پر بیٹھتا اور انکی ڈانٹ سنتا رہتا۔ گوپی کو انہوں نے اس سال سے ٹیوشن میں رکھا ہوا تھا۔ گوپی کے دادا کسان تھے اور والد دہلی

میں کسی کمپنی میں ملازم تھے۔ گوپی کی تعلیم میں گہری دلچسپی اور ذہانت دیکھتے ہوئے اس کے گھر والے اچھی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اس لئے پنڈت جی کی مدد درکار تھی۔ گوپی تو گزشتہ سال ہی ان سے ہندی اور سنسکرت پڑھنا چاہتا تھا مگر انہوں نے ٹال دیا تھا۔ بہت اصرار کرنے پر انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ اپنے کلاس میں اول آئے گا تو اسے ضرور پڑھاؤں گا۔ گوپی نے ان کی شرط پوری کر دی تھی اس لئے وہ ان کے درس میں شامل کر لیا گیا تھا۔ البتہ اس کے بیٹھنے کی جگہ فرش پر تھی، جہاں وہ بوریا بچھا کر زبان سیکھنے میں مہارت حاصل کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی بھی خواہش گرو جی کے پاس تخت (چوکی) پر بیٹھ کر پڑھنے کی ہوتی مگر یہ تمنا اب تک پوری نہ ہو سکی تھی۔ گوپی وقت کا پابند اور اپنے استاد کی عزت کرنے والا شاگرد تھا۔ اس نے استاد کی نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ اس بارے میں شنکر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے پاس گیا اور پنڈت جی کے بارے میں بتایا تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا ہے نا، وہ سوئے ہوئے ہیں۔ ایک دن تو پڑھائی سے جان بچی۔''

''نہیں، چلو نا ساتھ چل کے جگاتے ہیں گرو جی کو۔'' گوپی نے اس سے کہا تو وہ جلدی سے بول پڑا۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، پنڈت جی کو جگا کر مجھے مار نہیں کھانی ہے۔ ایک دن نہیں پڑھیں گے تو کیا ہو جائے گا۔''

گوپی من مسوس کر واپس آ گیا۔ جھانک کر کمرے میں دیکھا۔ پنڈت جی

پہلے کی طرح بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ وہ سوچنے لگا کیا کریں۔ اس کے ذہن میں آیا دادا جی کہتے ہیں جب کسی کو نیند سے جگانا ہو تو ان کے پاؤں آرام سے دبانا چاہئے۔ اس نے اپنی ہمت جٹائی اور کمرے کے اندر گیا۔ پنڈت جی پہلے کی طرح آنکھیں مُوندے پڑے تھے۔ اس نے ان کے پیر پر اپنی ہتھیلی رکھی۔ اسے جلن کا احساس ہوا۔ پنڈت جی کا پورا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ آہٹ پا کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ گوپی پیر دبا رہا تھا۔ انہوں نے پانی مانگا۔ گوپی بھاگتا ہوا نل سے تازہ پانی لے آیا۔ انہوں نے گٹا گٹ پانی پی لیا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

گوپی تھوڑا پریشان ہوا اور شنکر کو آواز دینے باہر نکلا مگر وہ تو کہیں غائب تھا۔ اس نے پنڈت جی کا انگوچھا (تولیہ) بھگویا اور ان کے سر پر پٹی کرنے لگا۔ اس نے ان کی ہتھیلی اور پیر بھیگے انگوچھے سے پوچھا اور انکی خدمت میں جٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد پنڈت جی نے راحت محسوس کی تو سنبھل کر بیٹھے۔ ان کا چہرا اتر گیا تھا۔ تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ گوپی اب بھی ان کی خدمت میں لگا ہوا تھا۔ کبھی ہتھیلی کی مالش تو کبھی سر کی۔ فرط جذبات سے انکی آنکھیں نم ہو گئیں لیکن انہوں نے اپنے آنسو چھپا لئے۔ انہیں ندامت ہو رہی تھی کہ گوپی کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ دل سے انہوں نے اب تک اسے اپنا شاگرد نہیں مانا تھا۔ اور وہ تھا کہ اپنے استاد کی خدمت میں بچھا جا رہا تھا۔ انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں اسے گھر جانے کو کہا۔ گوپی جانے کو تیار کہاں تھا۔ اس نے اپنی زبان کھولی۔

"میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ شنکر آ جائے گا تو میں آپ

کی دوا کے لئے بستی میں جاؤں گا۔ آپ آرام کیجئے گرو جی۔"

پنڈت جی نے باہر کی جانب دیکھا اور بولے۔ "وہ اب کیا آئے گا، شام ہونے کو آئی ہے۔ ہوگا کہیں مٹر گشتی میں۔"

"گرو جی تو پھر آپ میرے ساتھ بستی میں چلئے، یہاں میں آپ کو بیمار حالت میں چھوڑ کر گھر نہیں جاؤں گا۔" گوپی نے التجا کی۔

پنڈت جی گوپی جیسا شاگرد پا کر نہال تھے مگر ان کا دل بے چین تھا۔ آخر تھے تو گیان وان ہی، دل کی آواز پر بول پڑے۔ "میں نے تم کو شنکر سے نیچا سمجھا، میری بھول تھی۔ اب کل سے شنکر تمہارے ساتھ نیچے بوریا پر بیٹھ کر پڑھے گا۔"

گوپی کو تو مانو دل کی مراد مل گئی ہو۔ پنڈت دیا کانت مصر گوپی کا ہاتھ پکڑے محلے میں داخل ہوئے تو اس تبدیلی پر سبھی حیران تھے۔ آخر کار راجا چائے والے سے رہا نہیں گیا تو اس نے پوچھ لیا۔

"ارے گوپی، کیا بات ہے آج گرو جی کے ساتھ!"

گوپی کچھ بولتا کہ پنڈت جی نے ذرا بلند آواز میں جواب دیا۔ "اب اسے کوئی گوپی نہ پکارے آج سے یہ پنڈت گوپی ناتھ ہے، ہمارا وارث۔"

گوپی نے حسن اخلاق سے اپنے استاد کا دل جیت لیا۔

☆☆☆☆

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ، دہلی۔ دسمبر ۲۰۱۴ء)

آخری کوشش

ترانہ ختم ہوتے ہی ہیڈ ماسٹر گوپال ٹھاکر نے مائیک سنبھالا۔ انکی پاٹ دار آواز اسکول کے احاطے میں پھیل گئی۔ بچے ہمہ تن گوش ہو گئے۔ وہ سب جانتے تھے کہ اسمبلی کے بعد ان کا خطاب کچھ خاص ضرور ہوتا ہے۔ فی زمانہ جب اساتذہ کی عزت و توقیر کا گراف بہت نیچے گر گیا ہے، گوپال ٹھاکر دور دور تک ایک ہمدرد اور مثالی ٹیچر کے طور پر احترام پاتے تھے۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر بننے کے بعد بہت کم دنوں میں ہی ہائی اسکول کے نظم و نسق کو اتنا چست کر دیا تھا کہ دیہی علاقے کا یہ اسکول ضلع بھر میں نام روشن کر رہا تھا۔ انکی کاوش تھی کہ آنند نگر ہائی اسکول میں اب پرائیوٹ اسکولوں کی طرح کلاس روم میں ساؤنڈ باکس اور لان میں لاؤڈ اسپیکر لگائے گئے تھے۔ بچے ترانہ شروع کرتے۔

ہے پربھو آنند داتا گیان ہم کو دیجئے
شِگھر سارے درگنوں سے دور ہم کو کیجئے

لاؤڈ اسپیکر سے یہ آواز آس پاس پھیل جاتی اور راہگیروں کے پیر خود بخود ٹھہر جاتے۔ جو کل تک اس سرکاری اسکول کی خامیاں گنوانے میں پیش پیش رہا کرتے تھے وہ بھی اس نئے انتظام و انصرام پر خوشی کا اظہار کیا کرتے۔ وقت پر کلاسز، بچوں کی تعلیم، معاون سرگرمیاں یہاں تک کہ کھیل کود میں شمولیت میں اضافہ ہوا تھا۔ یہ سب ان کی دلچسپی اور محنت کا نتیجہ تھا۔ جب بھی کوئی پروگرام کرنا چاہتے یا کوئی خبر دینی ہوتی یا اعلان

کرنا ہوتا تو وہ اسمبلی کے فوراً بعد بچّوں سے مخاطب ہو جاتے۔ حسبِ سابق آج بھی وہ طلبہ سے مخاطب تھے۔

''پیارے بچّو! مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے اسکول نے سائنس فیسٹیول میں ضلع بھر میں سیکنڈ پوزیشن حاصل کی ہے۔''

بچوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ ابھی تالیوں کی گونج ختم ہوئی ہی تھی کہ وہ پھر گویا ہوئے۔

''یہ اچیومنٹ ہمارے اسکول کے ہونہار اسٹوڈنٹ نکّی کمار کی محنت اور لگن کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس لڑکے نے ایک بار پھر ہمارے اسکول کا نام روشن کیا ہے۔ مین چاہوں گا نکّی کمار کی ہمت افزائی زوردار تالیوں سے کی جائے۔''

دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور نکی کمار کسی سوچ میں گم اپنا سر جھکائے کھڑا رہا۔ جب بھی بچے اپنے اپنے کلاس میں چلے گئے، تو وہ ہیڈ ماسٹر چیمبر کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے گوپال ٹھاکر کے پیر چھوئے اور وہیں موجود سائنس ٹیچر ام اے صدیقی اور اردو ٹیچر محمد زمان کے پاؤں چھونے کو جھک گیا۔ تینوں فیسٹیول کی ہی باتیں کر رہے تھے۔ سبھوں نے اس کی پیٹھ تھپتھپا کر شاباشی دی۔ اب پہلی گھنٹی بج چکی تھی وہ اپنے کلاس میں چلا گیا۔ صدیقی صاحب اسکول کے بچوں کے ساتھ فیئر سے لوٹے تھے اس لئے وہاں کی روداد سنانے لگے۔

''کیا بتاؤں سر! ترہت اکادمی چھوٹی جگہ ہے بھیڑ زیادہ تھی۔ شہر کے اسکولوں کا بول بالا تھا، آپ تو جانتے ہی ہیں ایکسپرٹ ٹیم کے ممبران پروفیسر حضرات شہر کے ہی ہوتے ہیں۔ دیہات سے آئے طلبہ کے پرزنٹیشن پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ مگر نکی کمار نے تو کمال کر دیا سر۔ اس کے پروجکٹ کو دیکھتے ہی جیوری خود بخود

وہاں رُک گئی۔ ایکسپرٹ کے ذریعے پوچھے گئے سوالات کا جواب اس نے بڑی عقلمندی سے دیا۔ مجھے لگا تھا کہ اپنا اسکول اس دفعہ فرسٹ کر کے اسٹیٹ کے لئے منتخب ہو جائے گا لیکن ترہت اکادمی نے بازی مار لی، گرچہ اس کا پروجکٹ اتنا اچھا نہیں لگا تھا ہمیں۔ زیادہ تر لوگ نکی کے پاس ہی ٹھہرے تھے۔''

صدیقی صاحب نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ زمان صاحب پوچھ بیٹھے۔'' آخر کیا بنایا تھا نکی نے، ذرا ہم بھی تو سمجھیں۔''

گوپال ٹھاکر اور صدیقی صاحب مسکرائے۔ صدیقی صاحب نے چھیڑا۔'' میر و غالب کی شاعری نہیں ہے، سائنس ہے''

زمان صاحب کہاں چپ رہنے والے تھے'' میر و غالب کے علاوہ بھی کچھ یاد ہے آپ کو جناب صدیقی صاحب۔ مجھے بھی نیوٹن، الفرڈ نوبل، ڈالٹن یاد ہیں۔'' اب گوپال ٹھاکر کے ٹہوکا لگانے کی باری تھی۔ ٹھاکر جی نے صدیقی صاحب سے اختصار سے بتانے کو کہا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

نکی نے ایک ایسا کمپوسٹ تیار کیا ہے جس سے زمین کو زرخیز بنائے رکھتے ہوئے اچھی فصل تیار کی جاسکتی ہے۔ اس میں استعمال ہونے والی چیزیں زمین کو نقصان نہیں پہچاتیں بلکہ اس کی قدرتی طاقت کو بنائے رکھتی ہیں۔'' صدیقی صاحب نے بتایا۔

''آپ مجھے اس کو تیار کرنے کا نسخہ بتائے، میں اپنے کھیتوں میں اس کا استعمال کروں گا۔''

''گوبر، کھڑ پتوار، کچرا اور ساتھ میں کیچوا (ورمیز) کو ملا کر اسے تیار کیا جاتا ہے۔''

''واہ یہ تو کمال ہے، اس کا خوب استعمال ہونا چاہیے۔''

صدیقی صاحب پھر ہیڈ ماسٹر سے مخاطب ہوئے۔ ''ٹھاکر جی، اس کے لئے نکی نے کم محنت نہیں کی۔ کسانوں سے انٹرویو کیا، کھیتوں کا سروے کر کے رپورٹ جمع کی، لاگ بک بنایا، تب جا کر اس پروجیکٹ کو پورا کیا۔ ہم تو ایسے اسٹوڈنٹ پا کر دھنیہ ہیں۔''

صدیقی صاحب اسٹاف روم میں آئے تو وہاں بھی یہی ذکر تھا۔ ورما جی دو ماہ قبل ہوئے ماحولیاتی آلودگی پر مبنی ڈرامہ کمپیٹیشن میں اپنے اسکول خاص طور پر نکی کمار کی تعریف کر رہے تھے۔ ان کا بیان جاری تھا۔

''ہمارے بچوں نے ٹاپک رکھا تھا 'کیسا ہے انسان'۔ اس میں پیڑ کا کردار نکی نے نبھایا تھا۔ اسکی کہانی بے جوڑ تھی۔ ایک بچہ پیڑ کے پاس روتا ہوا آتا ہے۔ پیڑ اس سے رونے کی وجہ پوچھتا ہے، تو وہ بتاتا ہے کہ وہ بھوکا ہے۔ درخت اسے اپنا پھل کھانے کہ دیتا ہے۔ کچھ بڑا ہونے کے بعد وہ پھر پیڑ کے پاس آتا ہے اور اپنی بیکاری کے بارے میں بتاتا ہے۔ پیڑ اسے اپنی ٹہنیاں دیتا ہے تا کہ وہ اسے بیچ کر اپنا گزارا کرے۔ دوسرے پیڑ اسے منع کرتے ہیں اور انسان کی برائیوں سے آگاہ کرتے ہیں مگر درخت مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ اب لڑکا شادی کرنا چاہتا ہے جس کے لئے اسے گھر چاہئے۔ وہ پیڑ سے اپنی بات رکھتا ہے۔ اسے گھر بنانے کے لئے لکڑیاں مل جاتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد وہ فرنیچر کے واسطے پورا پیڑ ہی ختم کر ڈالتا ہے۔ اس طرح دوسرے پیڑ کہنے لگتے ہیں کیسا ہے انسان۔ بہت اچھا رول کیا تھا ہمارے بچوں نے۔ ماڑواری اسکول میں یہ کمپٹیشن ہوا تھا۔ سب کو لگتا تھا کہ ہم فرسٹ کریں مگر......... ابھی انکی بات ادھوری تھی کہ ایک کونے میں بیٹھے سب سے بزرگ ٹیچر نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''.....مگر آپ کے بچے سیکنڈ کر گئے۔ ورما جی ابھی آپ کو فرسٹ کرنے کے

گڑ جاننے میں وقت لگے گا۔"

اسٹاف روم، ہیڈ ماسٹر چیمبر، آفس یہاں تک کہ کلاسز میں طلبہ آج آپس میں یہی گفتگو کرتے رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ بچے ان سب سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے خواہاں ہیں اور اسکول کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔

وقفے کے بعد کلاسز میں لگا ہوا ساؤنڈ باکس بج اٹھا۔ ایک دفعہ پھر بچے ہمہ تن گوش ہوئے۔ ہیڈ ماسٹر کا اعلان تھا۔

"نکّی کمار کلاس نائنتھ سائنس فیسٹیول میں شامل ہوئے اپنے ساتھیوں کو لیکر ہمارے چیمبر میں آئیں اور یہ نوٹس سبھی بچوں کے لئے ہے کہ آنے والے مہینے کی آخری تاریخ کو ہونے والے بال وِگیان کانگرس میں حصہ لینے کے خواہشمند طلبہ، نئے ماڈل اور پروجیکٹ کے ساتھ سائنس ٹیچر صدیقی سر سے ملیں۔"

نکی کمار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہیڈ ماسٹر کے روبرو ہوئے تو وہاں صدیقی صاحب، سوشل سائنس ٹیچر اکھلیش پرساد، بایو سر نکھل کمار، اور فزیکل ٹیچر موجود تھے۔ گوپال ٹھاکر نے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کی چٹھی نکّی کو تھمائی، جس میں اعلان کئے گئے موضوع کی تفصیل تھی۔ اس نے غور سے پڑھا اور ساتھیوں کو بڑھاتے ہوئے بتایا کہ اس کا مرکزی موضوع پانی ہے۔ صدیقی صاحب نے جب اسے تیاری کرنے اور اس میں شامل ہونے کو کہا تو کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسرے لڑکوں سے انہوں نے پوچھا تو ایک نے بتایا۔ "سر نِکّی کہہ رہا تھا کہ اب وہ بھاگ نہیں لے گا۔ ہم سب بھی سوچ کر بتائیں گے۔"

گوپال ٹھاکر حیرت زدہ ہوکر بچوں کا منہ تکنے لگے۔ اچانک طلبہ میں آئی تبدیلی دیکھ کر وہ حیران ہوگئے۔ انہوں نے صدیقی صاحب کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا۔ ''تم سب کی مدد کے لئے یہ ہر وقت تیار رہتے ہیں اور جو خرچ اس میں آتا ہے، ہم اسٹوڈنٹس فنڈ سے ادا کرتے آئے ہیں، پھر کیا دقت ہے۔''

سر، اس کی تیاری میں وقت لگ جاتا ہے اور پڑھائی پیچھے ہو جاتی ہے۔'' نکی نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

گوپال ٹھاکر اور اساتذہ کے لئے اور بھی چونکنے کی بات تھی۔ جونیئر سائنٹسٹ کے نام سے مشہور اس طالب علم کی یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ فیزیکل ٹیچر نے کریدا۔ ''یہ بھی تو ایجوکیشن کا حصہ ہے۔ تمہارے نالج میں پلس پوائنٹ ہے یہ۔ ڈسٹرکٹ بھر میں تمہارا نام ہوتا ہے، تم لوگوں کے ٹیلنٹ کی تعریف ہوتی ہے، اس طرح تم اسٹیٹ اور پھر ملک بھر میں نام کما سکتے ہو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا سر!'' نکی نے زور دے کر کہا تو سبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر اس نے وضاحت کی۔ ''جانتے ہیں سر، آپ سب کی طرف سے مدد ملتی ہے اور ہم جی توڑ محنت بھی کرتے ہیں مگر........ ابھی تک ہم ضلع میں فرسٹ نہیں آسکے ہیں۔''

''ہاں ہاں، محنت کرتے رہو گے تو ایک نہ ایک دن فرسٹ آ جاؤ گے۔ اس میں کیا ہے، اسی دفعہ ایک دمدار پروجیکٹ بناؤ، پھر دیکھنا ٹاپ کر جاؤ گے۔'' بایو کے سر نے کہا۔

نکی مسکراتا ہوا بولا۔ ''نو سر! ایسا نہیں ہوگا۔ اب تک کے کمپیٹیشن کو میں نے دیکھا ہے۔ میں تو کہتا ہوں سر ڈسٹرکٹ لیول کا کمپیٹیشن آپ اپنے، ہمارے اسکول میں کرائیے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' محنت اور ایمانداری کی تعلیم دینے والے گوپال ٹھاکر

نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"ہمارے یہاں وینو ہوگا، جیوری آپ سب کی بات مانے گی اور ہم........پھر اسٹیٹ لیول کے لئے چنے جائیں گے، ورنہ تھرڈ اور سیکنڈ سے آگے نہیں جاسکتے۔"

سبھی ششدر رہ گئے۔ایک خاموشی....طویل خاموشی چھا گئی۔گوپال ٹھاکر بچوں کے خیالات جان کر سکتے میں تھے مگر ان کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔آج بھی ضلع بھر میں ایماندار اور اچھے اساتذہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔وہ محنت اور لگن کو ہی کامیابی کی کنجی مانتے تھے، تو بھلا اپنے بچوں کو اس طرح کیسے چھوڑ سکتے تھے۔انہوں نے بچوں کو یہ یقین دلایا کہ اس دفعہ کے مقابلے کا نتیجہ ایمانداری سے نکلے گا، چاہے اس کے لئے مجھے اپنے محکمہ سے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔انہوں نے جب اس کمپٹیشن میں نکی کمار اور گروپ کے ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تو سب کی باچھیں کھل گئیں۔

نکی اور بچوں نے خوب محنت کی۔انکی کوششیں جیسے آخری کوشش ہو۔

ٹرافی لیکر بچے اسکول پہنچے اور سیدھے ہیڈ ماسٹر گوپال ٹھاکر کے روبرو سر جھکائے کھڑے ہوئے۔نکی بہت خوش تھا مگر اپنے خیالات کے لئے شرمندہ بھی۔گوپال ٹھاکر مسرور تھے۔اس کو سر جھکائے خاموش دیکھا تو انہیں شاباشی دی اور بولے۔

"جھوٹ اور بے ایمانی کا بادل چاہے جتنا گھنا ہو، بہت دیر تک محنت اور ایمانداری کے سورج کو چمکنے سے روک نہیں سکتا۔"

☆☆☆

(بچوں کا ماہنامہ اُمنگ، دہلی۔جنوری ۲۰۱۲ء، بعنوان بیرومیٹر)

مُرجھائے پھول

دسویں جماعت کے طلبہ شور مچا رہے تھے لیکن انہیں خاموش کرنے والا کلاس میں کوئی نہیں تھا۔ سائنس کا پیریڈ تھا اور شکلا جی ندارد تھے۔ بچوں کو گپیں مارنے کا اس سے اچھا موقع کیا مل سکتا تھا۔ تیسرے بینچ پر بیٹھے آلوک، چندر اور موہن کے درمیان باتیں ہو رہی تھیں اور اگلے بینچ سے پیچھے مڑ کر کریم ان کی گفتگو میں شامل تھا۔ آلوک کو سائنس کی فکر ستا رہی تھی اور موہن اسے شکلا سر کے کوچنگ میں داخلے کی صلاح دے رہا تھا، جہاں وہ پڑھائی کے ساتھ مزے بھی کرتا تھا۔ آلوک اسکول کے ہونہار طالب علموں میں شمار کیا جاتا تھا مگر اس کے گھر کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں تھی کہ ٹیوشن لے سکے۔ اسے کوفت تھی کہ شکلا سر اکثر اپنا پیریڈ گول کر جاتے تھے جبکہ کوچنگ ایک دن بھی ناغہ نہیں کرتے۔ وہ جھنجھلا اٹھتا جب شکلا سر طلبہ کو کلاس ورک میں اُلجھا دیتے اور خود کُرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگتے۔ موہن اسے کوچنگ کے فائدے گنا تا اور مسکراتا ہوا آگاہ کرتا کہ وہاں تھک جاتے ہیں سر تو یہاں آرام کرنا نیچرل ہے۔ وہ فکر مند تھا اپنی تعلیم کو لیکر اور موہن مسرور تھا کوچنگ کی پڑھائی پر، لیکن چندر مغموم تھا دوسری وجہ سے۔ اس کی گائے بیمار تھی۔ وہ گئو ماتا کا سیوک تھا۔ دو دنوں سے وہ مویشی اسپتال دوڑ رہا تھا مگر ڈاکٹر لاپتا تھے۔ کریم خاموشی سے بیٹھا بدن کھجا رہا تھا، اسے خارش تھی

اور پرائمری ہیلتھ سینٹر کو لقوہ مار گیا تھا۔مہینوں سے وہاں ڈاکٹر نہیں آرہے تھے۔اس نے آلوک کی حمایت کرتے ہوئے فارسی مضمون کی پڑھائی نہ ہونے کا ذکر چھیڑ دیا جو اس کے مطابق مولانا صاحب کے جھاڑ پھونک کی نذر ہو گیا تھا۔چاروں ساتھیوں میں اسی طرح کی گفتگو ہو رہی تھی کہ دفعتہً فضا میں ہندی فلم کا ایک نغمہ ابھرا۔سب لاسٹ بینچ کی جانب متوجہ ہو گئے۔ گانے والا مسرور ہو گیا۔آلوک نے منھ بنایا۔اب کلاس میں شوروغل کی وجہ سے کان دینا مشکل تھا۔کریم کلاس سے باہر نکلا اور چند منٹ کے بعد واپس آیا تو اس کے چہرے سے ناگواری ٹپک رہی تھی۔چندر نے وجہ جاننی چاہی تو وہ بیزاری سے بولا۔

''باتھ روم اتنا گندا ہے کہ پیر رکھا نہیں جاتا،بدبو سے الٹی ہو جائے گی یار۔'' چاروں دوست سنجیدہ ہو گئے پھر اسکول کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔چندر نے شروعات کی

''ہیڈ سر کو کلاس اور صفائی پر دھیان دینا چاہیے۔ان سے کہا جائے ہو سکتا ہے......''۔

''بیکار ہے،نیتا گیری کا الزام لگا دیں گے اور ڈانٹ پڑے گی سو الگ۔ یاد کرو سائنس پیریڈ کے بارے میں جو کہا تھا۔'' موہن نے جواب دیا۔آلوک سر جھکائے بیٹھا تھا اور کریم اسکی کتابیں پلٹ رہا تھا۔کچھ دیر خاموشی رہی پھر کریم کی آواز ابھری۔

''ڈی ای او آجائیں ایسے میں تو کمال ہو جائے۔''

آلوک مسکراتا ہوا بولا۔ ’’تم اوّل درجے کے بیوقوف ہو۔ ڈی ای او صاحب آتے ہیں یا آئیں گے تو کیا ہوگا؟ سر لوگوں کی حاضری کاٹیں گے اور گھوس لیں گے اور کیا؟ آٹھویں سے اب تک یاد کرو، کب کلاس میں آئے ہیں ڈی ای او صاحب۔ میں نے تو ان کو دیکھا ہے تم سب تو دیکھے بھی نہیں ہو شاید۔‘‘

’’تم نے کب دیکھا ڈی ای او کو‘‘ چندر نے پوچھا۔

’’پچھلے سال جو سائنس فیئر میں گیا تھا انہوں نے ہی انعام بانٹا تھا۔ اب سوچتا ہوں بے کار گیا تھا تیاری تو کرائی نہیں گئی تھی صرف اسکول کو ریپرزنٹ کرنا تھا اسلئے ہم کو لے گئے تھے شکلا سر۔‘‘

ایک دو پل خاموشی رہی پھر آلوک نے کریم کو یاد دلایا۔

’’تم نے بھی تو دیکھا ہوگا ڈی ای او کو، فٹ بال میچ میں جو گئے تھے۔ یاد کرو افتتاح کیا ہوگا انہوں نے۔‘‘

’’ہاں ہاں یاد آیا ہماری ٹیم بری طرح ہاری تھی۔ پبلک اسکول کے پی ٹی سر کو دیکھا ٹریک سوٹ پہنے میدان میں پریکٹس کراتے ہوئے اور ایک ہمارے سر ہیں کہ کبھی میدان میں اترتے ہی نہیں۔ گیند بھی صرف ایک ہے۔ کہو تو بولیں گے اولمپک کھیلنا ہے کیا؟ وہ تو بڑی بات ہے اب تو کھیلنے کو بھی من بھی نہیں کرتا ہے۔‘‘ کریم اپنے دل کی بات بتا ہی رہا تھا کہ گھنٹی بج اٹھی۔ دوسرے کلاسز سے اساتذہ باہر آئے تو آوازوں کا سلسلہ پیچھے چھوڑ آئے۔ چہل پہل بڑھ گئی۔ اب ای وی ایس کا پیریڈ تھا۔ سہنی سر درجہ میں آئے تو سکوت کا عالم ہوا مگر انہوں نے آتے ہی اعلان کیا کہ

”مجھے کچھ ضروری کام ہے آفس جا رہا ہوں تم لوگ آج سیلف اسٹڈی کرو، ہاں آواز باہر نہیں جانی چاہیے۔“

وہ درجہ سے واپس ہوئے تو چاروں دوستوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ آج امریکہ کے تہذیب وثقافت کے موضوع پر لکچر تھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی مگر رفتہ رفتہ آواز بڑھتی چلی گئی اور ایک دفعہ پھر درجہ دس کے طلبہ شور وغل میں محو ہو گئے۔

چندر کو گائے کی فکر ہو رہی تھی۔ آلوک سائنس کی کتاب کھولے سوالات حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شور وغل کے درمیان یہ ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر چندر، موہن اور کریم بھی اسے باتوں میں لگائے تھا۔ کریم بار بار جسم کھجاتے ہوئے اسکول کی بدنظمی پر اپنی رائے دوستوں کو بتا رہا تھا کہ اچانک کلاس کے دو لڑکے آپس میں لڑ بیٹھے۔ افراتفری ہو گئی۔ آواز باہر گئی تو ٹیچرز کے ساتھ ہیڈ ماسٹر صاحب وارد ہوئے۔ دونوں کو سامنے کھڑا کیا اور ڈانٹنے کے بعد سہنی جی سے سرگوشی کی اور واپس چلے گئے۔ سہنی جی نے پہلے تو جم کر مورل لکچر دیا اس کے بعد امریکہ کے جغرافیائی حالات بتانے لگے۔ پیچھے بیٹھے لڑکے نے دھیرے سے ایک نغمہ چھیڑا، پھر کیا تھا سہنی سر کو موقع ملنے بھر کی دیر تھی۔ وہ شروع ہو گئے۔ دسویں جماعت میں ایسے لڑکے پر تمہیدی گفتگو اور استاد کی عزت تک کی کہانی سنائی گئی۔ آلوک سر پکڑ کر بیٹھا رہا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ سہنی جی اسکے استاد تھے اور استاد کی عزت کیسے کی جائے ابھی ابھی بتایا گیا تھا۔

ریسس کی گھنٹی بجی۔ کریم نے ڈبا کھولا، بھنے ہوئے چاول تھے۔ آلوک کے

پاس چورا تھا۔ موہن دو روپے کے چنے لے آیا۔ چندر کچھ نہ لا سکا تھا لیکن دوستی کے دانے میں برکت تھی، سبھی چباتے رہے اور کرکٹ کی گفتگو ہوتی رہی۔ ففٹی ففٹی ورلڈ کپ جیتنے کے بعد سریز پر قبضہ جمانے کی وکالت کریم کر رہا تھا جبکہ آلوک کو اپنی ٹیم پر بھروسا نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے مطابق اچھے کھلاڑیوں کو باہر بیٹھا دیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ سب میدان میں نکل آئے مگر بیچ میدان میں پرانے اینٹوں کا انبار تھا جسے اب تک ہٹایا نہیں گیا تھا۔ چندر کو ہریالی پسند تھی اس لئے میدان میں وہ ہری گھاس دیکھنا چاہتا تھا جیسا کہ بڑے لوگوں کی کوٹھی کے سامنے لان میں ہوتا ہے۔ وہ پھر خوابوں میں کھو گیا۔

لنچ کے بعد کلاسز میں لڑکے برائے نام تھے۔ کچھ اپنے گھر اور کچھ کوچنگ چلے گئے تھے۔ چاروں دوست بیٹھے اپنے مستقبل کی پلان کرتے رہے لیکن ٹیچر کلاس میں نہیں آئے۔ چپراسی نے آکر بتایا کہ ہیڈ کے ساتھ ہی زیادہ تر ٹیچر اسکول سے جا چکے ہیں۔ ان سب کا چہرہ اتر گیا۔

''کیا کریں ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ اب تو اسکول میں پڑھائی بھی نہیں ہوتی ہے۔'' چندر کے جملے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ کریم نے بھی افسوس کا اظہار کیا۔ موہن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

''ہم کو بھی لگتا ہے کوچنگ میں ایڈمیشن لینا ہی ہوگا۔ پتا جی بگڑیں گے مگر جب ساری باتیں انہیں بتائیں گے تو شاید مان جائیں۔''

آلوک نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا ''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔''

سب نے ایک ساتھ آلوک کو ٹوکا۔ ''تو کرو نا، کب کرو گے؟ جب ہم لوگ فیل کر جائینگے تب کیا؟'' باتیں کرتے ہوئے اچانک چاروں کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ سب نے یہ کام آلوک کو سونپا جو کلاس کا سب سے اچھا لڑکا تھا۔

سیاسی گلیارے میں ترقی کی گونج تقریر سے سنائی پڑتی ہے۔ ترقی کا کام چھوٹا کیوں نہ ہو اسکی پبلیسٹی بڑے پیمانے پر کرائی جاتی ہے اور عوام کو اس سے جوڑ کر آئندہ الیکشن میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ منسٹر سے لیکر سی ایم تک جنتا دربار لگا کر شکایتیں سنتے ہیں اور اخبار بازی کی جاتی ہے، اس کا فائدہ کتنا ہوتا ہے اس میں جانے والے جانتے ہیں۔ وزیر اعلی آج جنتا دربار سے واپس ہوئے اور فریش ہو کر اپنے کنبے کے ساتھ بیٹھے تھے۔ پی اے نے آکر اطلاع دی کہ کچھ خطوط ہیں۔ وزیر اعلی نے کل دفتر میں لانے کو کہا اور گفتگو میں محو ہو گئے۔ لوٹتے ہوئے پی اے نے دبی زبان میں عرض کیا۔

''سر ایک لیٹر ہے جس پر پرسنل لکھا ہوا ہے۔''

انہوں نے لفافہ لے لیا اور چاک کر خط پڑھنے لگے۔ نگاہیں تحریر پر پھسلتی رہیں اور ان کے چہرے کا تاثر بدلتا رہا۔ آخر میں وہ بے چین ہو کر ٹہلنے لگے۔ مسز نے دیکھا تو خط ہاتھ سے لے لیا اور ان کی نگاہیں تحریر پر دوڑنے لگیں۔

سی ایم انکل

نمسکار

ایک سال پہلے آپ ہمارے اسکول آئے تھے۔ آپ کے آنے سے پہلے

اسکول کی رنگائی ہوئی تھی۔ اندرون سڑک کی مرمت بھی ہوئی تھی۔ میرا اسکول چمکنے لگا تھا۔ گارڈن میں نئے پھول لگائے گئے تھے۔ ہم لوگوں نے آپ کو پھولوں کی مالا پہنایا تھا۔ اس دن علاقے کے سبھی ڈاکٹر اسپتال میں تھے۔ مویشی اسپتال میں بھی رنگ وروغن چڑھا تھا۔ سڑکیں برابر کرادی گئی تھیں۔ کتنے پولس والے آئے تھے اس دن اور سب مستعد تھے۔ دو چار مہینوں تک ہمارے گاؤں میں بھی چوکسی تھی۔ انکل جی، اب ہمارا اسکول .... میں نہیں لکھ سکتا۔ ہیڈ سر کو ہم لوگوں کے مستقبل سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہمارے ٹیچر کو چنگ چلاتے ہیں۔ اسکول میں گندگی کا انبار لگا ہوا ہے۔ باتیں تو بہت ہیں لیکن کیسے لکھیں چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی۔ بس ایک بار آپ ہمارے اسکول آجاتے تو مُرجھائے پھول پھر کھل اٹھتے۔ آپ سے ایک ونتی (گزارش) ہے، اس خط کے بارے میں ہمارے اسکول کے سر لوگوں مت کہیئے گا، وہ ہمارے گرو ہیں۔

پرنام

دسویں کلاس کے اسٹوڈنٹس

جنتا ہائی اسکول ولاس پور۔

مسز نے خط پڑھا اور پر امید نظروں سے بے چین ہو رہے سی ایم کی طرف دیکھنے لگیں۔ پی اے سامنے کھڑا تھا۔ انہوں نے ہفتے بھر کے اندر ولاس پور کا پروگرام طے کرنے کا حکم دیا اور کرسی پر نڈھال ہو گئے۔

☆☆☆

(سہ ماہی توازن، مالی گاؤں، سلسلہ نمبر ۴۴)

مصنف کا تعارف

نام : محمد مجیر احمد آزاد

قلمی نام : مجیر احمد آزاد

والد کا نام : عبد الجلیل

تاریخ پیدائش : ۷؍نومبر ۱۹۶۹ء

جائے پیدائش : محلہ: بھگوان پور، پوسٹ: نرہیا، ضلع: مدھوبنی (بہار)

تعلیم : ایم۔اے۔، بی۔ایڈ۔، پی ایچ۔ڈی

مشغلہ : درس وتدریس

مطبوعہ کتب : (۱) ڈوم (افسانوی مجموعہ) اشاعت۔۲۰۰۴ء

(۲) اندھیرے کا کرب (افسانوی مجموعہ)

اشاعت۔۲۰۱۰ء

(۳) جھکی ہوئی شاخ (افسانوی مجموعہ)

اشاعت۔۲۰۱۳ء

(۴) ٹھہری ہوئی صبح (افسانوی مجموعہ)

اشاعت۔2015ء

(۵) مقالات طرزی۔(ترتیب)

اشاعت۔۲۰۰۹ء

(۶) منظوم مقالے (ترتیب)

اشاعت۔۲۰۱۰ء

اشاعت آئندہ : (۱) دور دیس میں (افسانے)

(۲) کلاس ٹاپر (افسانے)

(۳) مدھوبنی: تاریخ وتعارف (تاریخ وتحقیق)

(۴) متھلا میں اُردو افسانہ: سمت ورفتار

(تحقیق وتنقید)

اعزازات : ☆ ساہتیہ کار سنسد سمستی پور کے ذریعے

''کیفی اعظمی ایوارڈ'' برائے سال ۲۰۰۵ء

☆ راشٹر بھاشا ہندی وکاس پریشد در بھنگہ کے

ذریعے ''پریم چند ایوارڈ''

رابطہ : محلّہ فیض اللہ خاں، خان صاحب کی ڈیوڑھی

پوسٹ لال باغ، در بھنگہ۔۸۴۶۰۰۴ (بہار)

موبائل نمبر : 9430898766

ای میل: mojeerazad@rediffmail.com

☆☆☆

AAO KAHANI SUNTE HAIN

Mojeer Ahmad Azad

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-5073-578-7
₹ 40.00